© rasailojaraid.com

فرنگی نظامِ تعلیم کا زہر

محترم اوریا مقبول جان

یہ ایک چھوٹا سا پانچ کمروں کا اسکول تھا جہاں پڑھنے کے لیے ٹاٹ گھر سے لانا پڑتا تھا۔ درمیان میں پانی کا ایک نلکا اور چھوٹا سا حوض تھا جس میں ہم تختیاں دھوتے اور ان پر گاچنی (ملتانی مٹی) مل کر دھوپ میں سکھاتے۔ صبح کی اسمبلی میں قطار در قطار کھڑے جب اقبال کی دعا "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یک زبان ہو کر پڑھتے تو میں اپنے دینیات کے ماسٹر جی کا چہرہ دیکھ رہا ہوتا۔ خوشی سے تمتمایا ہوا اور پھر جب ان کا ہاتھ دعا کے لیے بلند ہوتا اور ہم بچے ان کی دعا کے بعد بلند آواز سے آمین کہتے تو پتہ نہیں کیوں ان کی آنکھوں سے اتنے آنسو چھلکتے کہ ان کی سفید ڈاڑھی بھیگ جاتی۔ مجھے آج بھی ان کی وہ دعا یاد ہے جو انھوں نے ہمارے پرائمری کے نتیجے والے دن ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے گڑگڑا کر کی تھی: "اے اللہ! یہ بچے تیرے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے پھول ہیں، ان کو کامیابیاں عطا فرما۔ ان کی زندگیوں میں صدیق اکبر کی صداقت، عمر فاروق کی عدالت، عثمان غنی کی سخاوت اور حیدرِ کرار کی شجاعت کی جھلک پیدا کر۔" معلوم نہیں یہ اس نیک انسان کی دعا کا اثر تھا یا ہمارے نصاب کی کتابوں میں جگ مگ کرتے ماضی کے ذکر کی تاثیر تھی کہ میں یا میرے اسکول کے ہزاروں ساتھی جو زندگیوں کی کامیابیوں کے کتنے زینے طے کر چکے ہیں لیکن ان کے دلوں سے ہیرو اور ان کی یادوں سے یہ کہانیاں محو نہ ہو سکیں گی۔ دنیا میں پرستش کا کوئی بھی معیار آ جائے ہمارے لیے صداقت، عدالت، سخاوت اور شجاعت کا معیار یہی لوگ رہے۔ لیکن آج ان ہیروز کو ہم سے جدا کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ آج ایسا نہیں ہو رہا بلکہ اس کا سفر بہت طویل اور کہانی بڑی دل گداز ہے۔ آیئے! میں آپ کو تاریخ کے ایک چھوٹے سے سفر پر لیے چلتا ہوں۔

یورپ جب نپولین کے زمانے میں ہونے والی طویل جنگوں سے فارغ ہوا اور لاکھوں انسانوں کے قتل و غارت کے بعد قدرے سکون کی حالت میں آیا تو اسے گیارہویں اور بارہویں صدی کی صلیبی جنگوں کے دکھ اور صدمے یاد آنے لگے۔ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو ان کا مکمل ادراک تھا کہ خواہ جنگ ہو یا تبلیغ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جس کو مذہب پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۲۱۹ء میں سینٹ فرانسس کی مثال بہت اہم ہے جو شدید صلیبی جنگ کے بعد جب مصر پہنچا تو وہاں لوگوں نے کسی قسم کی مذہبی بحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھی نہ تو مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہوئے نہ مارے گئے اور نہ ہی لوگوں نے ان کی باتوں پر کان دھرا۔ جس کا بدلہ انھوں نے اسپین اور مراکش کی آبادیوں میں تشدد اور بربریت سے لیا لیکن اب یورپ کی چار بڑی سلطنتیں، برطانیہ، فرانس، پرتگال اور ولندیزی مسلمان ملکوں پر چڑھ دوڑی۔ ۱۷۵۸ء کی بنگال کی فتح سے ۱۷۹۸ء کی ولندیزیوں کی انڈیز کے علاقے پر کنٹرول سے لے کر ۱۹۵۶ء میں سویز نہر پر فرانس اور برطانیہ کی جنگ تک ۷۰ سے زیادہ لڑائیاں لڑی گئیں اور دنیا بھر کی مسلم آبادی ان حکومتوں کے زیر اثر آ گئی لیکن تاریخ کے صفحات اب اس حیثیت سے پوری طرح آشنا ہو چکے ہیں کہ یہ قومیں صرف تجارتی مقاصد اور توسیع سلطنت کے لیے نہیں نکلی تھیں بلکہ عیسائی مشنریوں کی منظم کوشش بھی تھی کہ مسلم دنیا کو کیسے عیسائی بنایا جا سکتا ہے۔ یوں ان چاروں قوموں کے چرچ اکٹھے ہوئے اور انھوں نے پوری دنیا سے چھ علاقوں کو چنا جہاں مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیت کی ترویج کی جا سکتی ہے۔

(۱) ہندوستان (۲) انڈیا (۳) مشرق وسطیٰ (۴) شمالی افریقہ یعنی مصر، سوڈان، مراکش وغیرہ (۵) افریقہ یعنی ایتھوپیا، کینیا، تنزانیہ وغیرہ (۶) چین اور دیگر علاقے۔ ان صدیوں میں جب تک ان قوموں کا اقتدار رہا حکومت خواہ کسی ملک کی بھی ہوتی ان تینوں ملکوں کی مشنریاں ایک ساتھ مل کر کام کرتیں۔ یہاں میں کہانیاں نہیں بیان کرنا چاہتا کہ کیسے انڈونیشیا میں حج پر پابندی سے لے کر مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند کرنے تک۔ الجزائر میں جا بجا گرجا گھر کھولنے سے کبائلہ کے علاقے میں کئی سو مشنریوں کو بھیجنے تک کیا کیا اقدام نہ کیے گئے؟ ۳۵۰ سال کی محنت جن میں اسپتال کھولے گئے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یتیموں کے ادارے بنائے گئے، گرامر اور کانونیٹ اسکول کھولے گئے لیکن سالوں میں صرف چاند ہزار لوگ مسلمان ہو سکے جن میں اکثر وہ یتیم تھے جو ان اداروں میں پلے بڑھے تھے۔ کینا ئلہ سب سے زیادہ کامیابی کی مثال ہے جہاں ۲۵۰ سال کی محنت کے بعد ۱۹۳۰ء تک صرف ۷۰۰ لوگ عیسائی بن سکے۔

اب سر جوڑے گئے تحقیق ہوئی اور ایک راستہ ڈھونڈا گیا۔ بقول گیز "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مسلمانوں پر کون حکومت کرتا ہے؟ یہاں تک شدید ترین مخالف حکمران بھی ان کو دین بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا البتہ تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جہاں سے ان پر حملہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم غیر رسمی ہے اور فاتح قوم کی انتظامی مشینری کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لیے یہ لوگ مجبوراً آپ کا دیا ہوا نظامِ تعلیم اپنائیں گے اور یوں ایک ایسی نسل تیار ہو جائے گی جو معاشرتی، معاشی اور اخلاقی طور پر اسلام سے دور لیکن نام اور نسب کے اعتبار سے مسلمان ہو۔" یوں برصغیر میں ۱۸۷۳ء میں پہلا عیسائی مبلغ بنگال آیا جو زراعت اور تعلیم کا ماہر تھا۔ اس نے ان دونوں شعبوں میں کام کیا اور صرف ۵۰ سال کے عرصے میں وہاں ۸۳ گاؤں ایسے تھے جو عیسائی آبادی پر مشتمل تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب انگریز اس خطے پر برسر اقتدار ہوئے تو انہیں معلوم تھا کہ مسلمان سے زیادہ "سخت جاں" قوم اس خطۂ ارضی پر نہیں پائی جاتی۔ یہ جنگوں میں ہمیں سپاہی مہیا کرتے، کالا پانی جیسی سزائیں برداشت کرتے ہیں، تنگ آ کر ہجرت کرتے ہیں لیکن اپنا مذہب نہیں چھوڑتے۔ اس زمانے کے نو آبادیاتی حاکم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانوں کے ملکوں میں ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کر دیا جائے جو ان سے ان کے اپنے اسلاف اور اپنی اقدار سے محبت چھین لے تو پھر ان کی آئندہ نسلیں ایسی ہوں گی جن کے نام تو مسلمانوں جیسے ہوں گے لیکن جن کے ہیروز، جن کے معیارات، جن کی زندگی گزارنے کے طریقے، سب ہمارے جیسے ہوں گے، انہیں مجلسِ شوریٰ کے لفظ سے چڑ ہو گی اور پارلیمنٹ سے محبت، ان کو دو کمروں کے کچے مکان میں رہ کر آدھی دنیا پر حکمرانی کرنے والے فاروقِ اعظم کا کردار اچھا نہیں لگے گا، بلکہ وہ سیزر کی کہانیوں اور نپولین کے قصوں کو یاد کریں گے۔ انہیں محفلوں میں بیٹھ کر اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آئے گی اور وہ روسو، سارتر، جان آف آرک اور شیکسپیئر جیسے نام لے کر اپنا سر فخر سے بلند کیا کریں گے اور پھر ایسا صرف ایک سو سال کے اندر ممکن ہونے لگا اور ایک شرمندہ قسم کی مسلمان قوم بنتی گئی۔

مگر اس قوم کی خاکستر میں کہیں نہ کہیں چنگاریاں سلگتی رہیں۔ بھوسے کے ڈھیرے میں اندر ہی اندر جذبوں کی آگ بھڑکتی رہی۔ یہ خواہ مسجدوں کے منبروں سے ہونے والے ماضی کے تذکروں سے ہوا یا ہمارے نصاب تعلیم میں اسلام کے ذکر سے یا پھر کسی دینیات کے اس جیسے بوڑھے استاد کی دعاؤں سے...... مگر پوری دنیا کے وہ مغربی حکمران جو اطمینان کر بیٹھے تھے ان کو اس آگ کا دھواں نظر آنے لگا۔ اعداد و شمار جمع ہوئے تو یہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے کہ گزشتہ ۵۰ سال میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی میں ۲۳۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ سترہویں صدی میں افریقہ سے لوگوں کو پکڑ کر امریکا لایا جاتا تھا۔ ان بے چارے مظلوموں میں سو سے بھی کم افراد ایسے تھے کہ جو اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے لیکن یہ صرف ایک سو افراد دو سو سال کے اندر آج ایک کروڑ ہو چکے ہیں اور ان میں ۳۰ فیصد لوگ ایسے ہیں جو اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے اور سب سے زیادہ مذہب اس وقت تبدیل ہوا جب یہ لوگ جیل میں تھے۔ قتل کر کے، چوری کر کے، ڈاکے ڈال کر مجرمانہ زندگی گزارتے ہوئے جیل پہنچے اور نورِ ہدایت لے کر باہر آئے۔ ایسا صرف امریکا میں نہیں ہوا بلکہ دنیا بھر میں یہ نور پھیلنے لگا۔ امریکا میں مسلمانوں کے اضافے کی شرح ۲۵ فیصد ہے جب کہ یورپ میں ۱۴۳ فیصد اور آسٹریلیا میں ۲۵۷ فیصد اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں ان کے اضافے کی شرح بہت کم ہے۔ ایشیا میں ۱۲ فیصد اور افریقہ میں صرف ڈھائی فیصد۔ ۱۹۹۶ء میں مسلمان ایک ارب ۴۸ کروڑ تھے اور آج ایک ارب ۹۰ کروڑ ہیں۔ یہ جنگل کی آگ پھیلی تو حیرت زدہ طاقتیں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں، اس کھوج میں لگ گئیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی؟ کہاں اس قوم کا رابطہ اپنی اقدار اور اپنے اسلاف سے قائم رہ گیا؟

پوری دنیا میں محققین کا جال پھیلا دیا گیا۔ ورلڈ بینک کے تعلیمی فنڈ، یو ایس ایڈ اور یونیسکو نے رپورٹیں مرتب کرنا شروع کیں اور پھر گزشتہ ۲۰ سال میں نئے نعرے تخلیق کیے گئے۔ انسانی حقوق، حقوق نسواں، بچوں کے حقوق، فری مارکیٹ گلوبلائزیشن، لیبر لائزیشن، پوری دنیا کی منڈیوں، اسکولوں، اسپتالوں اور کارخانوں میں ایک طرح کی اقدار، روایات اور ماحول کو جنم لینا چاہیے۔ ہر خاندان ایک طرح کی طرز زندگی پر بچے پرورش کرے۔ ہر اسکول ایک طرح کی عالمی اخلاقیات کو نافذ کرے۔ ورلڈ بینک کی رپورٹ Globalisation & Pvverty وہ راستے متعین کے لیے ایک نکاتی ایجنڈا تھا جسے ۱۹۸۰ء سے آہستہ آہستہ روبہ عمل کیا گیا۔ ورلڈ بینک اس سارے عمل کو تاریخی طور پر تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک جب ان کی نظر میں بہت معاشی ترقی ہوئی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک جب ترقی یافتہ ملک متحد ہوئے اور ایک نئے انسانی نظام کو جنم دیا اور تیسرا دور ۱۹۸۰ء سے شروع ہوتا ہے جب اس انسانی نظام کو پوری دنیا تک پھیلانا باقی ہے۔ اس نظام کے تین بنیادی تصورات ہیں: (۱) کثیر المعاشرتی نظام (Multi Culturatior) (۲) اجتماعیت (Pluralism) (۳) عالمی نظام (Globalisation)۔

ان سارے منصوبہ سازوں کے نزدیک ایک نکتہ سب سے اہم تھا کہ جب تک تعلیم کے نظام کو حکومتی اختیار سے لے کر ایک منظم قسم کے پرائیوٹ سیکٹر میں نہیں دے دیا جاتا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ پرائیوٹ سیکٹر دنیا بھر کی تجارت کے مطابق لوگوں کو تعلیم دے گا اور حکومتوں پر جو لوگوں کا اخلاقی اور مذہبی دباؤ ہو گا وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس سارے کاروباری حملے کی ایک مثال میں آپ کو اپنے ملک پاکستان سے دوں گا۔

اس وقت پورے پاکستان میں ۳۶۱۰۹ پرائیوٹ تعلیمی ادارے ہیں۔ یہ ادارے ایک سال میں لوگوں کی جیبوں سے ۲۲ ارب روپے کماتے ہیں اور ان کا کل خرچہ صرف ۱۲ ارب روپے ہے۔ یوں آمدنی کا ۵۰ فیصد ان کاروباری لوگوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں صرف تین فیصد کسی یونی ورسٹی یا بورڈ سے منظور شدہ ہیں۔ ۶۴ فیصد رجسٹرڈ ہیں اور باقی نہ رجسٹرڈ ہیں اور نہ ہی منظور شدہ۔ ان اداروں میں ۹۴ فیصد پرائمری تعلیم دیتے ہیں۔ ان ۳۶ ہزار اداروں میں صرف تین لاکھ استاد ہیں اور یوں فی ادارہ صرف آٹھ استادوں کی شرح بنتی ہے۔ پرائمری سے ہائی اسکولوں تک ۶۵ فیصد ایسے استاد ہیں جو غیر تربیت یافتہ ہیں اور ان میں ۱۵ فیصد تو صرف میٹرک ہیں اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ادارے جو سالانہ ۲۲ ارب روپے کماتے ہیں ان کی ۲۸ فیصد آمدنی داخلے کی فیس سے ہوتی ہے یعنی لوٹ مار کی انتہا داخلے کے وقت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

یہ تعلیمی ادارے گزشتہ ۲۰ سال سے ایک ایسے ماحول کو جنم دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس راستے کو آسان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں پڑھنے والوں کی ساری نگاہیں آکسفورڈ سے کیمبرج تک اور کولمبیا سے برکلے تک مرکوز ہیں۔ وہ صوفی تبسم، اسماعیل میرٹھی اور الطاف حسین حالی کی نظموں کی بجائے نرسری Rhyms کی گود میں پروان چڑھے۔ اس سارے نظام کو گزشتہ تین سال کی مغرب زدہ حکومت نے اپنے اور اپنے آقاؤں کے ایجنڈے کے مطابق آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اور یہ ایجنڈا کوئی خفیہ نہ تھا، ۲۳ اپریل ۹۹ء کو برلن میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور اس کا موضوع "مغربی اور اسلامی معاشروں کے تعلقات" تھا اس کانفرنس میں ایک برلن ڈیکلیریشن جاری کیا گیا جس کا مقصد تھا: Global Whol Sound, Global Unity, Global Motiality۔

اس ڈیکلیریشن میں کہا گیا کہ ہمیں پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ ایک ایسے نظامِ تعلیم کو مرتب کرنا ہوگا جو آسٹریلیا کے شہر سڈنی سے امریکا کے شہر ہوائی تک ایک طرح کے ہیروز، ایک جیسی اقدار اور ایک جیسی سوچ کو جنم دے اور اس سارے کام کے لیے پیسوں پر پلنے والی این جی اوز کو سامنے لایا جائے اور پھر اس ملک میں این جی اوز پر مشتمل ایک حکومت وجود میں آ گئی۔ MSU, DFID, JEKA, CEDAW جیسے ڈونرز نے پیسوں کے منہ کھول دیئے۔ ۴۰ سے زیادہ سفارت خانوں نے اپنے سفارت خانے میں ایک سیل قائم کیا جو ان این جی اوز کو امداد دینے لگا۔ انسانی حقوق، حقوقِ نسواں، بچوں کے حقوق، عورتوں پر تشدد اور گراس روٹ جمہوریت جیسے نعرے دیئے گئے اور مجبور کیا گیا کہ ان کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ وہ قوم جو انسانی حقوق کا چارٹر ۱۴۰۰ سال پہلے دیئے گئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کو سمجھتی تھی اسے بتایا جانے لگا کہ ۱۹۹۵ء کی بیجنگ کانفرنس نے عورتوں کو حق دیا۔ C.R.C کے بچوں کو حقوق دینے کے لیے انسانوں کو انسان سمجھا۔ وہ یہ تمام تر اپنے نصاب میں دیکھنے لگے جو کبھی یہ سنتے تھے کہ تم پر کسی انسان کی جان اس مقام اور اس پسینے سے زیادہ مقدس ہے۔ تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فوقیت نہیں۔

لیکن اس سارے معاملے میں دکھ کا پہلو یہ تھا کہ تعلیم عام آدمی کی دسترس سے دور ہوتی گئی اور پنجاب کی تاریخ میں بورڈ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی طالبہ کنیرڈ میں داخلہ نہ لے سکی کیونکہ اس کے والدین کے پاس داخلہ فیس کے لیے ۳۸ ہزار روپے موجود نہ تھے۔ این جی اوز کے سرکردہ آغا خان کے ادارے سے جناب لاکھا کو تعلیم میں ریفارمز کے کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ جن کا نعرہ یہ تھا کہ تعلیم کم از کم اتنی تو مہنگی ہو کہ والدین کو اس کا احساس ہو سکے۔ اس لیے کہ ان کے سامنے ۳۶ ہزار پرائیوٹ تعلیمی ادارے موجود تھے جو لوگوں کی کھال کھینچ کر پیسے وصول کر رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ یوں تعلیم کو صرف ایسے طبقوں تک محدود کر دیا جائے جہاں ان کے منظورِ نظر کلچر کی آبیاری آسانی سے ہو سکتی ہو۔ تعلیم کو ایک Comondity یعنی ایک جنس بنا دیا جائے اور جس کی جیب میں پیسے ہوں وہ اسے خرید سکے۔ اور یہ ایک ایسی قوم کو سکھایا جا رہا تھا جو بغداد کے مدرسوں، مصر کی جامعہ الازہر، سمرقند و بخارا کی تعلیمی درس گاہوں کے وارث تھے۔ جہاں تعلیم کے نام پر پیسہ لینے یا منافع کمانے کو حرام سمجھا جاتا تھا اور اسی روایت کو انھوں نے ماڈرن تعلیمی اداروں تک قائم رکھا۔ ۱۹۷۳ء تک کوئی پرائیوٹ تعلیمی ادارہ، اسکول، کالج یا یونی ورسٹی ایسی نہ تھی جس کے دروازے سے غریب گھر کے طالب علم کو خوف آتا ہو، جہاں مزدور اور غریب کے بچے نہ داخل ہو سکتے ہوں۔ یہ وہ ادارے تھے جن کی عمارتیں لوگوں کے چندے سے تعمیر نہیں، علی گڑھ سے لے کر دیوبند تک اور انجمن حمایت اسلام سے لے کر سندھ مدرستہ الاسلام تک۔ جہاں محمد علی جناح سے لے کر اقبال تک اور سر شاہ سلیمان سے لے کر فیض احمد فیض تک پڑھتے رہے۔ جہاں کے پڑھے لکھے لوگ نہ ایچی سن کے خوف کھاتے تھے اور نہ کانونٹ اور گرامر اسکول سے مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایسے ہی بوریا نشین اسکولوں سے بوعلی سینا نے جنم لیا تو یورپی دنیا میں طب کا باب کھلا، جابر بن حیان پیدا ہوا تو سائنس کی راہیں متعین ہوئیں، ابن الہیثم نے علم حاصل کیا تو ریاضی کے اصول متعین ہوئے۔ اور آج دنیا کی کوئی ماڈرن سے ماڈرن یونی ورسٹی علوم کی اس سیڑھی پر قدم رکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی...... لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اپنی روایت پر قائم، اپنی انفرادیت برقرار رکھیں اور پوری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھنے والے خاموش بیٹھے رہیں۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھے کہ ۱۱ ستمبر آگیا۔ اب تو لوہا گرم ہو یا نہ ہو...... وار ضروری ہو گیا تھا۔ امریکا کے دفتر خارجہ نے ۱۱ ستمبر کے فوراً بعد لاکھوں ڈالر دے کر بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کو ایک پروجیکٹ دیا کہ ہم مسلمان ملکوں میں تعلیم کے نظام کو کیسے "درست" کر سکتے ہیں؟ ستمبر ۲۰۰۲ء میں پی ڈبلیو سنگر کی سربراہی میں ایک رپورٹ بنائی گئی اور بتایا کہ ہم کیسے مسلمانوں سے ان کی روح اور اقدار کو ان سے دور کر سکتے ہیں؟ پہلا کام ان ملکوں میں نظامِ تعلیم سے ان حصوں کو نکالنا ہے جن سے ان کے اسلاف کے کارناموں کی بو آتی ہو۔ ان کی اقدار جن میں انصاف، اخلاق، شرم و حیا، عدل اور حاکمیت الٰہی شامل ہے اس کی جگہ حقوقِ نسواں، عالمی برادری، انسانی حقوق اور مذہبی جبر کے خلاف تحریک وغیرہ کو شامل کرنا ہے۔ لبرل تعلیم کا نعرہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ اس پالیسی کے نفاذ کے آغاز میں امریکا کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی (USAID) نے پاکستان کو ۱۰۰ ملین ڈالر کی امداد کا اعلان کیا تاکہ تعلیمی میدان میں اصلاحات کی جائیں۔ یونیسکو کے ایک اہم رکن اور ٹاسک فورس کے چیئرمین ہنری روسکی کو اس کام کے لیے مخصوص کیا گیا اور ورلڈ بینک کی رپورٹ 239/6-PAK میں مدارس کو کنٹرول کرنے کا راستہ دکھایا گیا۔

بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کی یہ رپورٹ اپنی نوعیت کی پہلی رپورٹ ہے جس میں کھل کر کہا گیا ہے کہ تمام این جی اوز اور پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں لبرل اور مذہب سے بیگانہ لوگ موجود ہیں۔ ان کو ڈھیروں امداد دی جائے۔ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو اسکالر شپ دی جائیں اور جن اداروں میں مذہبی لوگ شامل ہیں ان سے حکومت کے ذریعے معاشی ناکہ بندی کروائی جائے اور غیر فعال کیا جائے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کہتا ہے کہ تعلیمی اداروں کو جتنا ممکن ہو سکے پرائیوٹ سیکٹر میں دیا جائے تاکہ ان کے بورڈوں کو مالی امداد کے ذریعے مجبور کیا جا سکے کہ وہ ہماری مرضی کا نظامِ تعلیم اپنے اسکولوں میں رائج کریں اور پورے ملک میں گزشتہ ایک سال سے اس کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ احتجاج کریں ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہمیں تو کھنکھناتے ہوئے ڈالروں میں ملنے والی امداد چاہیے۔ کتابیں مرتب ہو رہی ہیں۔ ورکشاپ منعقد ہو رہے ہیں۔ کنسلٹنٹ اسلام آباد کے سرسبز ماحول میں بیٹھے کام کر رہے ہیں اور ۱۰۰ سال پہلے اس ملک کو ایک بے سروپا نظامِ تعلیم دینے والے ایک بار پھر اسی مسلمان قوم کا خواب دیکھ رہے ہیں جن کی نصاب کی کتابوں میں ڈھونڈنے سے بھی صدیق اکبر کی صداقت، فاروقِ اعظم کی عدالت، عثمان غنی کی سخاوت اور حیدرِ کرار کی شجاعت کا تذکرہ نہ مل سکے اور اگر ایسے میں اگر دینیات کا کوئی بوڑھا استاد آنسوؤں میں بھیگی دعاؤں میں ان شخصیات کا ذکر کرے گا تو بچے حیرت سے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں تھے؟ ہمارا ان کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں......؟ تو میرے دوستو! یہ ہیں ہماری بربادیوں کے وہ مشورے جو بند کمروں میں طے پا کر کھلے میدان میں آچکے ہیں۔ کیا ہم اپنے تعلیمی نظام کو، اپنے بچوں کے مستقبل کو ان منصوبوں کا شکار ہونے سے بچا سکتے ہیں؟ یہ سوال آج ہر اس محب وطن سے ہو رہا ہے جو اسلام کے نونہالوں کو مسلمان اور محب اسلام و پاکستان دیکھنا چاہتا ہے۔

© rasailojaraid.com